جدید اُردو نظم گو شاعرات کی عصری و تانیثی فکر کا مطالعہ

نبیل احمد نبیل
محمد محسن

Abstract:

Female writers of modern urdu poetry have written on various social, political issues and have also criticized such human behaviours and also attempted to poetically narrate the obstacles emergent problems of the society wich tend to obstruct the modernity and human freedom. They have amply elaborated the selfish and hypocritic position of men angainst women. Besides, they appear to have also criticized such male chauvinism through which the men persist to see the women through their physical being alone. Modren female writers have more particularly,through the medium of urdu poem,have demonstrated their unbending rejection to various social taboos and uncalled for dictats while raising questions on male dominance.Feminist poetesses of urdu mainly revolve their poems aruondboldness,rebellion and protest,without falling prey to pseudo intellectualism.

ہزاروں سال کی معاشرتی زندگی نے عورت اور مرد کے درمیان طبقاتی تقسیم کو جنم دیا ہے۔عورت کو صنفِ نازک کہہ کر حاشیے کی جانب دھکیل دیا جاتا ہے۔حیاتیاتی سطح پر بھی عورت اور مرد کے نہ صرف تجربات میں امتیاز ہے بل کہ محسوساتی سطح پر بھی دونوں میں فرق ہے مگر صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت کو بھی قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔سماجی سطح پر عورت اور مرد کے بعض مسائل اگر چہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں مگر عورت اور مرد کے مابین تقسیم میں مردانہ شاونزم ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔سماج میں مختلف سطحوں پر عورت کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے،جس کے خلاف دنیا بھر کی تخلیق کاروں،صحافت،سیاست،اقتصادیات اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں نے صرف اپنے مساویانہ حقوق کے لیے آواز بلند کی بل کہ تحریکوں کی صورت میں بھی اپنی مسلسل کاوش کو جاری رکھا۔خواتین کی اپنے حقوق اور صنفی امتیاز کے خلاف مختلف شعبہ ہائے زندگی میں یہ جنگ مسلسل اور دیرپا ہے جس کا آغاز تو یورپ کے مختلف ممالک سے ہوا مگر برصغیر کی بھی اکثر تخلیق کار خواتین بعد میں اُن کی ہم آواز

نظر آتی ہیں۔

ریاستی اداروں میں عورت نے نہ صرف اپنی آواز کو منوایا بل کہ اپنی شناخت اور احترام کے لیے بھی طویل جدوجہد کی ہے۔ مرد نے جب بھی عورت کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تو ہراساں کرنے کا عمل نام نہاد عزت کی وجہ سے دب گیا یا دبا دیا گیا مگر جیسے ہی عورت کا شعور بے دار ہوا تو اُس نے ہراساں کیے جانے پر احتجاج کیا۔عورت نے اپنی یہ جنگ اُس مردانہ بالادستی کے نظام کے خلاف لڑی، جس مردانہ بالادستی کے معاشرتی نظام میں اُسے کبھی صنفِ نازک، کبھی باندی، لونڈی، کبھی کنیز اور نوکرانی جیسے درجوں تک رکھ کر، اُس کی تحقیر کا ہر پہلو روا رکھا گیا۔اُس کو جائیداد کے حق سے بھی محروم رکھا گیا، یہاں تک کہ ایک دور میں اُسے ووٹ یعنی حقِ رائے دہی سے بھی محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ ماضی بعید میں عورت کو یورپی جامعات میں پڑھنے کی اجازت تو دے دی گئی مگر ڈگری سے محروم رکھا جاتا رہا۔ جاگیردارانہ معاشرے میں اب بھی ذہنی وفکری پسماندگی موجود ہے۔عورت نے مرد کی بالادستی کو ہر سطح پر چیلنج کیا ہے، کہیں وہ عملی سطح پر ریاستی اداروں سے اپنا حق مانگنے کی جدوجہد کرتی ہوئی نظر آتی ہے تو کہیں اُس نے اپنی تخلیقات اور تحریروں میں اپنے مذکورہ مسائل کے لیے آواز بلند کر کے قانون سازی کروانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

جدید اُردو نظم گو شاعرات کے یہاں عصری حسیّت کے پس منظر میں تانیثیت کی رو اور روایت نمایاں انداز میں ملتی ہے۔انھوں نے تانیثی تجربات واحساسات کو بیان کرتے ہوئے تحریک سے زیادہ رویّے پر زور دیا ہے اسی لیے بیش تر شاعرات میں متوازن اور معتدل انداز فکر ملتا ہے۔ کچھ شاعرات کی شاعری میں مزاحمتی فضا اور مردانہ جرأت وجسارت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔انھوں نے مرد اور عورت دونوں کے مسائل کو سنجیدگی سے خلق کیا ہے اور مردانہ معاشرے سے مکالمہ کرتے ہوئے زیادہ درشتی اور کرختگی اختیار نہیں کی۔خواتین نظم نگاروں کی عصری حسیّت کے بارے میں محسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''صنف نازک نے اردو ادب کی ترویج میں بھرپور کردار ادا کیا ہے......اردو ادب نے انیسویں صدی میں فکروتاثر، تجربہ اور ہیئت کے اعتبار سے معراج کی سمت سفر کا آغاز کیا مگر وہ دور ہندوستان میں سیاسی شکست وریخت، سماجی نشیب وفراز اور معاشرتی اقدار کی تعمیر وتخریب کا دور تھا اور عورت کو معاشرہ میں آزادی اظہار کا حق گھر کی چار دیواری سے باہر حاصل نہ تھا۔۔۔حالات کے بدلنے کے ساتھ سماجی اقدار نے بھی پیرہن بدلنا شروع کیا تو خواتین کے ادراک وآگہی اور شعور نے بھی اظہار کی راہ تلاش کرنا شروع کی۔''(۱)

عورت کو ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ کے کبادے سے نکل کر ایک الگ جنس (عورت) کی شناخت حاصل کرنے میں بہت وقت لگا، جدید اُردو نظم کی متعدد شاعرات نے تعلیم نسواں، حقوق نسواں، آزادی اور مساوی حیثیت کی بات کی ہے۔ترقی پسند تحریک نے سب سے پہلے حقوق نسواں کا ادبی نعرہ لگایا،تحریکِ تانیثیت سے متاثر ہو

کر خواتین نظم نگاروں نے نسائی حقوق ضبط کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور عورت کے نفسیاتی دباؤ کو استعاراتی شکل میں تخلیقات کا حصہ بنایا۔ڈاکٹر رشید امجد خواتین نظم نگاروں کے فکر وفن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری شاعرات نے صرف رومانی آرزومندی ،ذہنی ونفسیاتی تطابق ،سپردگی اور بیگانگی جیسے موضوعات پر ہی سخن فرمائی نہیں کی بلکہ موجودہ دور میں پروان چڑھنے والے رجحانات ومحرکات اور سالیب فکر وفن سے بھی آگاہی حاصل کی ہے۔ان کے شعری تجربے اپنے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔وہ معنی جن میں ہماری ہستیوں کو نیا طرز ملا،جن کے حوالے سے ہم نے اپنے عہد کے انسانوں کے داخلی وخارجی،نفسیاتی اور رومانی مسائل کا مشاہدہ ومطالعہ ایک مختلف نقطہ نگاہ سے کیا ان کا ادراک ہماری جدید دور کی شاعرات کو بخوبی ہے۔''(۲)

خواتین نظم نگاروں نے محبت اور وفا کی خواہش ،انا کی تعمیر وشکستگی سے لے کر سماجی تعصّبات ،رویّوں اور رجحانات کو موضوع بنایا ہے اور عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے منفی تفاوت اور منافقانہ رویّے کو بھی بے نقاب کیا ہے۔زیرِ نظر آرٹیکل میں ادا جعفری، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، نور جہاں ثروت، شبنم شکیل، پروین شاکر، فاطمہ حسن، ثمینہ راجہ، شاہین مفتی، منصورہ احمد، نسیم سید، صادقہ نواب سحر، عذرا پروین، شبنم عشائی، ترنم ریاض، حمیدہ شاہین اور نسیم صحرائی کی نظموں میں عصری اور تانیثی وحسّی مباحث کے جائزے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ادا جعفری کی ابتدائی شاعری میں کلاسیکی رنگ غالب ہے بعد میں انھوں نے الگ ڈکشن اور منفرد انداز اپنا لیا۔ادا جعفری کا پہلا شعری مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' قیام پاکستان کے بعد شائع ہوا۔ادا جعفری نے مناظر فطرت کو احتجاج اور بغاوت کا استعارہ بنایا۔اس ضمن میں نظم ''یہ مرے دل کو خیال آتا ہے'' دیکھیے:

دیکھ تو سرمئی آکاش پہ تاروں کا نکھار/رات کی دیوی کے ماتھے پہ چنی ہے افشاں/یا کچھ اشکوں کے چراغ/ہیں کسی رہگزر میں لرزاں/آہ یہ سرمئی آکاش/یہ تاروں کے شرار/وہم آتا ہے مگر/نغمہ ونے کا سہارا لے کر/زندگی چل بھی سکے گی کہ نہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ادا نے جذبہ حب الوطنی کا بھرپور اظہار کیا،انھوں نے ابتدا میں اقبال کا اثر لیا، ''غزالاں تم تو واقف ہو'' میں فیض سے متاثر دکھائی دیتی ہیں اور ''ساز سخن بہانہ ہے'' میں ان کا اسلوب انفرادیت کا حامل ہے۔ان کی حبِ وطن اور حبِ انسان کے جذبے سے سرشار نظم ''سانجھ سویرے'' اہم ہے۔ادا جعفری کی شاعری جدید اردو نظم کی شاعرات کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوئی ہے اگر چہ ان سے کچھ عرصہ پہلے حیا لکھنوی، نوشابہ قدوائی، زاہدہ خاتون شروانیہ اور ذکیہ سلطانہ جیسی شاعرات نے شعر گوئی کی۔ادا جعفری سب سے زیادہ زاہدہ خاتون شروانیہ سے متاثر نظر آتی ہیں کیوں کہ ز۔خ۔ش اس دور کی واحد شاعرہ تھیں جنھوں نے تعلیم نسواں اور حقوق نسواں

کے لیے آواز بلند کی۔انھوں نے سماجی مسائل اور ہندوستانی خواتین کی جہالت کا نقشہ کھینچا ہے،اس حوالے سے ڈاکٹر نبیل احمد نبیل اپنی تصنیف ''حیات زخ ش'' میں رقم طراز ہیں:

''ز۔خ۔ش شاعری کو قومی خدمت کا بہترین ذریعہ سمجھتی تھیں......وہ ایک مصلح قوم کے طور پر ایسے خیالات کے اظہار پر دست رس رکھتی تھیں جو اس دور میں علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی کی شاعری کے ذریعے فروغ پا رہے تھے۔سجاد حیدر یلدرم بقول قرۃ العین حیدر انھیں عورتوں کا اقبال کہا کرتے تھے......انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں عام عورت پر ہونے والے ظلم وتشدد کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا سب سے بڑا سبب عورتوں کی ناخواندگی کو قرار دیا۔''آئینہ جرم'' جیسی نظموں میں انھوں نے اس پہلو پر قلم اٹھایا اور پوری دردمندی کے سے عورتوں کی جہالت کو مردوں کی جابرانہ پالیسی کا نتیجہ قرار دیا۔تاہم وہ محض مردوں ہی کو اس امر کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتیں بل کہ عورتوں کو بھی اپنی ناخواندگی کے باعث اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافیوں کا ذمہ دار سمجھتی ہیں۔''(۳)

ادا جعفری جدید نسائی لہجے اور انقلابی رجحان کی وجہ سے معاصر پیش رو شاعرات میں ممتاز نظر آتی ہیں اگر ضمیر جعفری اور حمایت علی شاعر نے انھیں جدید اردو نظم کی خاتونِ اوّل کہا ہے تو بجا ہے۔۱۹۶۳ء کے بعد ابھرنے والی شاعرات میں ادا جعفری واحد شاعرہ تھیں جنھوں نے نظم اور غزل میں صیغہ تانیث کا استعمال انتہائی بے باکی اور مردانہ جرأت مندی سے کرتے ہوئے عصری مسائل کی خوب عکاسی کی۔اس بارے میں ڈاکٹر رشید امجد مزید رقم طراز ہیں:

''ادا جعفری کی شاعری سماجی سچائیوں،امن وآشتی اور انسان دوستی کی شاعری ہے۔زمین اور اس پر بسنے والے انسانوں سے محبت اور لگاؤ ان کی تخلیقی کاوشوں کی بڑی بنیادی خصوصیت ہے۔فکر کی ندرت،فن کی شائستگی،اظہار کی متانت اور عالم گیر شعور کی نوعیت ان کے لہجے کی انفرادیت ہے۔''(۴)

ادا جعفری نے کرب،تنہائی اور اجتماعی رویّوں کو نئے نسائی نقطۂ نظر سے دیکھا اور شاعری میں پیش کرنے کے لیے جرأت،ہمت اور جدت کی برقی رو کا استعمال کیا۔ان کی شاعری میں جہاں پاکستانی تاریخ رقم کی گئی ہے وہاں انھوں نے پاکستان میں عورت کو ملنے والے مقام کو بھی ایک دابستان کی صورت میں پیش کیا ہے۔انھوں نے مشرقی سماج کی عورت کی بے بسی،مجبوری اور گھٹن سے پیدا ہونے والے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کی ترجمانی کی ہے۔نظم ''التفات گریزاں'' میں انھوں نے مشرقی عورت کے محبت بھرے جذبات بیان کیے ہیں اور ''تعمیر نو'' میں

عورت کے احساسِ کمتری کو احتجاجی انداز میں پیش کیا:

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک
محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک
دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی
سر گشتہ رہے گا صفتِ جام کہاں تک
کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیث رخِ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک

عورت میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کے لیے معاشرے نے اس کے ساتھ کم عقلی اور کمزوری وابستہ کر رکھی ہے اس لیے وہ کچھ نیا قدم اٹھانے کے لیے ڈرتی ہے۔ ادا جعفری نے عورت کے ذہن سے یہ ڈر نکالنے کی کوشش کی ہے نظم ''لرزاں سائے'' اس کی مثال ہے۔ انقلابی رجحان اور عصری حسیّت کی حامل نظم ''شکست ساز'' حبس بے جا اور گھٹن کے ماحول میں جکڑی ہوئی عورت کو آواز ہے جو گل ریز فضاؤں کی تمنا کرتے ہوئے گھبراتی ہے کیوں کہ اس کی تمنائیں زندگی کی تند آندھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، وہ صرف ایک آہ، گھٹتی ہوئی چیخ اور امیدوں کا نوحہ ہی بیان کر سکتی ہے:

میں نے گل ریز بہاروں کی تمنا کی تھی/ مجھے افسردہ نگاہوں کے سوا کچھ نہ ملا/ چند سہمی ہوئی آہوں کے سوا کچھ نہ ملا/ آسماں نور کے نغمات سے معمور سہی/ میں نے گھٹتی ہوئی چیخوں کے سنے ہیں نوحے۔

ادا جعفری نے اپنی نظموں میں مشرقی عورت کو عزت، غیرت اور آبا و اجداد کے روایتی فیصلوں کی بھینٹ چڑھانے کے واقعات کی مذمت کی ہے۔ مشرقی عورت جب اپنے حق کی بات کرتی ہے تو اسے گناہ سمجھا جاتا اور اَن گنت اس کے دشمن بن جاتے ہیں اس لیے سماج دشمنی کا خوف عورت کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔ ادا کے شعری مجموعہ ''غزالاں تم تو واقف ہو'' کی نظموں ''کوئی پیاں نہیں''، ''رنگ کے روپ ہزار'' اور ''مسجد اقصیٰ'' میں سماجی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے عورت کے تشخص اور سیاسی و سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے، ان کے مجموعے ''جوئے نغمہ'' کی نظم ''کھنڈر'' میں فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہونے والی لڑکی کی ذہنی و قلبی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے، اس فرقہ وارانہ فسادات میں اس کا سارا کنبہ جلا دیا گیا:

کوئی بتا دے کہ کھنڈرات کے اندھیرے میں/ کہاں تلک یہ زخمی حیات لے کے پروں؟/ کوئی بتا دے کہ اس رنگ و بو کی دنیا میں/ میں کب تک یہ لٹی کائنات لے کے پھروں

ساجدہ زیدی نے اپنے شعری مجموعہ ''آتش سیال'' میں عورت کی شخصی محرومیت، لوگوں کی بے بسی، بے کسی، دورِ حاضر کے مسائل اور انسان کی تنہائی و کرب کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ نسائی جذبات کی ترجمانی

کرتی ہوئی ان کی نظم ''وہ پل یہ گھڑی'' میں ایک ماں کی اپنے بچے کے لیے پنپنے والی محبت کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

وہ پل/جب تمھیں کوکھ سے جَنن کے/امیدوامکاں کا تارا سمجھ کر/میں نے آغوش میں بھر لیا تھا/وہ پل/سرخ کلیوں کو جب/اپنے سینے کی دھارا سے سینچا تھا/اور اپنی ہی تشنگی کا مداوا کیا تھا/وہ پل/وقت کی رہ گزر میں/بہت دور پیچھے کہیں رہ گیا ہے/اوراب/جب کہ تم آئے ہوئے/اپنے ہی گھر میں مہمان بن گے/تمھیں دور جانا ہے

عورت ہی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہے لیکن ہمارے سماج میں اسے وہ قدر و منزلت نہیں ملتی جس کی وہ اہل ہے۔ساجدہ زیدی نے یہ احساس دلانے کی سعی کی ہے کہ ایک ماں کس طرح اپنے بچے کی ولادت سے اس کی پرورش تک مسائل سے گزرتی ہے۔''میرے نونہالوں کی'' اس نوع کی دوسری نظم ہے۔ساجدہ زیدی نے سیاسی و سماجی لیڈروں کی کردار کشی بھی کی ہے۔ہمارے لیڈروں کو صرف اپنی مسند عزیز ہے، وہ اس کو بچانے کی فکر میں رہتے ہیں اور عوام کے مسائل اور مستقبل کی کسی کو کوئی پروا نہیں۔انھوں نے نظم ''سال اطفال اور سیاسی بازیگر'' میں ہندوستان کی سچی تصویر کشی کی ہے:

یہ دیکھو/تم ہو جس دھرتی کے سوامی/یہ اسی دھرتی کے باسی ہیں/ کہیں فٹ پاتھ پر بوٹ پالش کررہے ہیں/ کہیں اخبار کی چنگھاڑتی/اعلان کرتی سرخیاں ہاتھوں میں تھامے/بسوں کاروں کے پیچھے دوڑتے ہیں/ کہیں اسکول سے آتے ہوئے/خوش پوش ہم عصروں کے آگے/چشم حسرت ہو گئے ہیں/ کہیں غول بیابانی کے آگے /دست سائل بن گئے ہیں/ کہیں کوڑے کے انباروں میں/ایک روٹی کا ٹکڑا ڈھونڈتے ہیں۔

ساجدہ زیدی نے بے انصافیوں، محرومیوں، ظلم و جبر اور استحصال کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور امن، محبت اور رواداری کا پیغام دیا ہے۔وہ ملک میں انتشار اور بدامنی کی صورت حال سے سخت نالاں ہیں۔انھوں نے گجرات سے ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے دوران مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی، اس کی ایک مثال گجرات کے شہیدوں کے نام لکھی نظم ''نسل کشی'' ہے۔ساجدہ زیدی کی شاعری کا کینوس بہت پھیلا ہوا ہے انھوں نے محض عشق عاشقی کے نغمے نہیں الاپے بل کہ نئے خیالات اور موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کے شعری نظریے اور موضوعات سے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے ڈاکٹر وسیم بیگم رقم طراز ہیں:

> ''ساجدہ کی شاعری کسی بھی تحریک سے براہ راست متاثر نظر نہیں آتی لیکن ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے ضرور قریب ہیں۔پھر بھی انھوں نے ترقی پسند شعرا کی مانند انقلاب کے نغمے نہیں گائے نہ ان کے یہاں وہ انتہا پسندی نظر آتی ہے جو ان شعرا کا خاصہ تھی۔اس کے برعکس ان کے یہاں ایک طرح کی متانت، سنجیدگی اور بے باکی نظر آتی ہے۔ساجدہ نے اپنی شاعری کے ذریعے زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔''(۵)

ساجدہ زیدی کی بہن زاہدہ زیدی کی ابتدائی نظموں میں رومانیت حاوی ہے مگر انھوں نے متعدد سماجی مسائل کو بے نقاب کرنے کی سعی بھی کی ہے۔انھوں نے دور حاضر کے انسان کی بے بسی، بے چارگی اور مجبور زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ان کی شاعری میں ''سیاہ'' برائی کی علامت ہے،نظم ''رات کی تیرگی'' میں انھوں نے طاقتور کو کمزور پر رات کی تاریکی میں وار کرتے دکھایا ہے:

ہاں اٹھالو انھیں/رات کی تیرگی میں/مٹادو در وبام سے/ان کے تازہ دہکتے لہو کے نشاں/ کھینچ کر ڈال دو/ان کی لاشوں کے انبار میں/دفن کر دو کہیں دور افتادہ قبروں میں/لہروں کے ریلے میں یا ڈال دو یا انھیں نذرِ آتش کر دو

زاہدہ زیدی نے اس نظم میں ہندوستان کے اقلیتی طبقے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ان پر ظلم وستم کیے جاتے ہیں اور رات کی تاریکی میں انھیں اٹھا کر قتل کر کے لاشوں کو دفن یا جلا دیا جاتا ہے تا کہ کوئی پوچھ بھی نہ سکے کہ قتل ہونے والا کون تھا۔انھوں نے معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلنے والے طبقے کی مذمت کی ہے۔زاہدہ زیدی نے عورت کی شخصیت، اس کی حیثیت اور کردار کو پیش کیا ہے۔روز اوّل سے مرد عورت پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھاتا ہے، اسے کم تر سمجھتا ہے جب کہ دور حاضر کی عورت تعلیم یافتہ ہے اور مرد کے برابر صلاحیتیں دکھا رہی ہے۔انھوں نے عورت کو زیادہ تر مظلوم شکل میں پیش کیا ہے، دیہاتوں میں کس طرح عورت پر ظلم کیا جاتا ہے۔انھوں نے معاشرے میں تیزی سے پھیلتے ہوئی جہیز کی لعنت کو موضوع بنایا ہے اور نظم ''جنگل'' میں عورت کا تشخص تلاش کیا ہے:

کوئی انسان مجھ کو ملے اگر/تو پوچھوں/ کہ کیا میں ابھی تک/وہی شعلۂ اندام/سیماب پا/فرطِ ہستی سے بے تاب/درد آشنا/ایک انسان ہوں/یا فقط/ کوئی ٹوٹا ہوا ہاتھ

زاہدہ زیدی نے نسوانیت کے معنی اور احساس کی نئی جہتیں دریافت کی ہیں۔انھوں نے سماجی مسائل اور عام انسانی مسائل کو شاعری میں بیان کیا ہے۔''سیاہ سوراخ''، ''آگ'' اور ''کربلا'' ان کی اہم استعاراتی نظمیں ہیں۔نظم ''کربلا'' میں موجودہ دور کی عکاسی کی گئی ہے، اس دور میں چاروں طرف اگر نگاہ دوڑا کر دیکھیں تو کربلا کا ماحول اور آہ و بکا دیکھنے کو ملے گی۔معصوم لوگوں کا قتل، لڑکیوں کی عصمت دری اور کمزور طبقے پر ہونے والے ظلم وستم کربلا کا منظر پیش کرتے ہیں۔زاہدہ زیدی کی حسِ تانیث نظم ''مادر مہربان'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔اس نظم میں انھوں نے عورت کے عزم، محبت اور عظمت کا ذکر کیا ہے۔زاہدہ زیدی کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر وسیم بیگم رقم طراز ہیں:

> ''زاہدہ زیدی کی شاعری ایک ایسی عورت کی شاعری ہے جس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، انھوں نے سماجی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ان کی شاعری میں قاری خود سانس لیتا ہے اس میں ایک طرح کا اپنا پن اور قرب محسوس کرتا ہے۔''(۶)

زاہدہ زیدی نے دورِ حاضر کے انسان کی الجھنوں اور پریشانیوں سے بوجھل زندگی کی عکاسی کی ہے نظم ''وہ بارگراں'' میں بوجھ تلے دبی زندگی اور انسان کی مجبوریوں کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے بڑے شہروں میں آبادی میں اضافے کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا ہے اور دیہات سے شہروں کی طرف منتقل ہونے والے لوگوں کو سر پر زندگی کے بوجھ لیے حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے دکھایا ہے۔انھوں نے ملک میں ہونے والے فسادات کا ذکر کیا ہے،عام آدمی فسادات میں جن ایذیتوں سے گزرا اسے نظم ''فسانۂ دردِ بے زباں ہے'' میں یوں بیان کیا ہے:

ہوا میں آہٹ ہے سسکیوں کی/ فضا میں بوخون کی بسی ہے/ برہنہ لاشیں/ خلا میں چشم حیرت سے تک رہی ہیں/ ہیں جن میں لاکھوں سوال پنہاں/ نہیں ہے جن کا جواب کوئی

زاہدہ زیدی نے اپنی متعدد نظموں میں یہ بتایا ہے کہ ایک عورت کی تصوراتی دنیا تو بہت اچھی ہوتی ہے جہاں اسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہوتی ہے،وہ ہر کام اپنی مرضی سے کر سکتی ہے لیکن میں اسے سماج کی درجنوں رکاوٹیں سہنا پڑتی ہیں۔زاہدہ زیدی کی شاعری کا دائرہ وسیع ہے انھوں نے عصری مسائل کو تازگی اور نئے احساس کے ساتھ بیان کرتے ہوئے مذہبی فسادات،انسان کے درد و کرب،بچوں،عورتوں اور کمزور طبقے پر ہونے والے ظلم و ستم کو موضوع بنایا ہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظموں کا اسلوب دیکھیں تو اسلامی تاریخ اور فلسفے سے متاثر نظر آتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ددھیال اور ننھیال پر تصوف اور شیعت کا رنگ غالب رہا۔انھوں نے مذہبی،تاریخی اور ملکی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ عورت پر ہونے والے جبر کو معنی خیز علامتوں سے بیان کیا ہے۔شعریٰ صاحبہ کو اپنے وطن اور نگر سے والہانہ لگاؤ ہے اور انھوں نے ان ناساز گار حالات کا ذکر بھی کیا ہے جس کے نتیجے میں بے گناہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔انھوں نے عصری مسائل پر طنز کیا ہے کہ آج کا انسان بے یقینی کی صورت حال سے دوچار ہے کیوں کہ اسے اپنے اوپر بھروسا نہیں رہا۔انھوں نے اپنے بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے وقتی سکون تلاش کیا ہے اور عورت کو مرد کے برابر صلاحیتوں کی حامل قرار دیتے ہوئے اس پر بے جا سماجی پابندیوں کو سخت ناپسند کیا ہے۔شعریٰ عورت کی بے بسی،بے چارگی،بے وقوفی اور بے چینی کو اپنی نظم ''آزردہ قمری'' میں یوں بیان کرتی ہیں:

تمھاری سسکیوں کو سن رہا ہوں میں چٹانوں میں/ دہکتی جا رہی ہو تم/ ابھر آؤ نہیں میں سنگ دل/ افسردہ قمری/ انھوں نے کس دیے ہیں شکنجے/ تمھارے خوش نما شہر پر/ وہ تم سے کھل نہیں سکتے/ تو آؤ میں نہیں بے دست و پا/ غم دیدہ قمری/ نگاہوں کی کمندوں سے جکڑ سکتی ہو تم سورج کو/ اور سیلِ صبا کو تھام سکتی ہو/ اٹھو میں بھی نہیں ہوں سست رو

شعریٰ نے نظم ''شاہ راہِ آرزو'' میں اس دنیا میں بسنے کی بات کی ہے،کس طرح یہ بستیاں اور شہر بسائے گئے ہیں اور کیسے مرد اور عورت مل کر محنت کرتے ہیں۔کسانوں کو کھیتوں میں ہل چلاتے اور سینچتے دکھایا ہے اور ان کے

پیٹ بھرنے کے لیے معصوم دوشیزاؤں کو کھانا لاتے دکھایا ہے۔انھوں نے مسلسل نظموں کی شکل میں مختلف موضوعات کو یکجا کیا ہے۔زہرا نگاہ نے اپنی متعدد نظموں معاشرتی رویّوں پر نکتہ چینی کی ہے اور ایسی عورت کو موضوع بنایا ہے جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک رئیس گھرانے میں کر دی گئی ہے اس لیے وہ روایتی عائلی اقدار نبھانے کے باوجود گھٹن محسوس کرتی ہے، یہ شعری اقتباس ملاحظہ کیجیے:

بال بال موتی پرواؤں /پور پور میں ہیرے پہنوں/ کام کاج کا پلو ڈالے /دن بھر گھر سے الجھوں سلجھوں/رات کو لیکن آنکھیں موندے/ پچھلی رُت کا ساون دیکھوں/ جگ مگ جگ مگ ہونے جیسا/ گھر سب کی نظروں میں آیا/ بھیگا آنچل، پھیلا کاجل/ کس نے دیکھا کس نے چھپایا

ہمارے معاشرے میں یہ عام رواج ہے کہ والدین بیٹیاں مال دار گھرانے میں بیاہتے ہیں تا کہ وہ عیش وعشرت اور آسائشوں بھری زندگی بسر کریں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بے جوڑ شادیاں اور مادی آسائشیں عورت کی زندگی میں سکون پیدا نہیں کر سکتیں۔نظم ''آنگن'' ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے۔زہرا کی نظم ''جرم وعدہ'' عورت کی ذہنی کشمکش کی عکاسی کرتی ہے جو اپنے خواب اور خوشیاں اپنی اولاد کی تربیت اور آبرو کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ انھوں نے مشرقی عورت کو حیا اور وفا کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے، زہرا نگاہ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد رقم طراز ہیں:

> ''زہرا نگاہ اپنی شاعری میں گھر کی بنیادوں میں وفا کے رشتوں کی تہذیب کرتی اور رفاقتوں کو نئے معنی پہناتی ہیں۔رفاقتوں اور محبتوں کے اس سفر میں زہرا نگاہ کے یہاں روایتی عورت کے جتنے روپ بھی نظر آتے ہیں، ان میں ذاتی زندگی کی تلخ و شیریں لمحوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اس عورت کے وجود کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے جو اس استحصالی معاشرے کی کڑی دھوپ تاپتے تاپتے اب کندن بن چکی ہے۔''(۷)

مرد اور عورت کی رفاقت کبھی ختم نہیں ہو سکتی لیکن یہ رفاقت کبھی منافقانہ اور کبھی مصلحت آمیز بھی ہوتی ہے ،زہرا نگاہ نے مرد اور عورت کی اس رفاقت کو سمجھوتا قرار دیا ہے، ''سمجھوتا'' کے عنوان سے لکھی نظم دیکھیے:

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر/یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے/ کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں/ کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے/اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا/اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے /نہ خوش ہو گے، نہ پژمردہ رہو گے

زہرا نگاہ نے ہر عمر کی عورت کے جذبات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے عورت کی جوانی کی الجھنوں اور آسائشوں کو ہی بیان نہیں کیا بل کہ بڑھاپے کی کج رویوں کا ذکر بھی کیا ہے۔انھیں اپنے وطن سے بے پناہ عقیدت ہے و محبت ہے وہ کراچی کے حالات دیکھ کر اضطراب کا شکار ہوئیں۔ان کی شاعری میں انسان سے محبت اور

انسانیت کے تحفظ کی گونج سنائی دیتی ہے۔نظم ''سنا ہے'' ملاحظہ کیجیے:

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے/سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے تو وہ حملہ نہیں کرتا/سنا ہے جب کسی ندی کے پانی میں بسئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے/تو ندی کی روپہلی مچھلیاں اس کو پڑوسی مان لیتی ہیں/ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں/تو مینا اپنے گھر کو بھول کر کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے/سنا ہے گھونسلے سے کوئی بچہ گر پڑے تو سارا جنگل جاگ جاتا ہے/ندی میں باڑ آ جائے/ کوئی پل ٹوٹ جائے تو/ کسی لکڑی کے تختے پر/ گلہری، سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں/سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے /خداوندا! جلیل و معتبر! دانا و بینا! منصف و اکبر/ہمارے شہر میں اب جنگلوں ہی کا کوئی دستور نافذ کر!

کشور ناہید نے خواتین کے حقوق کی آواز بلند کرتے ہوئے نہ صرف عورت کی محرومیوں کا تذکرہ کیا بل کہ مرد کے برابر حقوق کا مطالبہ کر دیا ہے۔انھوں نے پاکستان میں خواتین کی بے داری کی جو تحریک چلائی اسے عالمی سطح پر بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔پاکستانی معاشرے میں خواتین میں شعور و آگہی کے فروغ کے سلسلہ میں ان کی ادبی اور سماجی خدمات قابل ذکر ہیں۔کشور ناہید نے عورت کی مظلومی اور مجبوری سے لے کر اس کے معمولی جذبات و احساسات کو بھی شعری زبان دی ہے۔انھوں نے اس زوال پذیر نظام کے خلاف ایک ردعمل ظاہر کیا ہے،''لب گویا' کے بعد کی شاعری میں ان کا مزاج مستقل مزاحمتی انداز اختیار کر لیتا ہے۔وہ اس روایتی مردانہ معاشرے کے خلاف ایک باغی اور سرکش کے روپ میں نظر آتی ہیں۔کشور ناہید کی شاعری کا یہ امتیاز بھی ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں جنسی ہیجان میں مبتلا مشرقی مرد اور عورت کی کیفیات بیان کرتے ہوئے نہایت بے پردگی اور سچے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔اس سماجی حقیقت پر ان کی ایک اہم نظم ''سانپ کینچلی'' دیکھیے:

ہمارے ملک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت ہے/ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے کی/اجازت نہیں/وہ شاید اسی لیے شادی کرتے ہیں/ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خون/اور آنکھوں کی لووں تک پھیلے جذبوں کو/شادی کا نام دیتے ہوئے

کشور ناہید کی نظموں میں جنسی ہیجان کی متعدد تمثیلیں نظر آتی ہیں،ان تمثیلوں کے ذریعے کشور نے سچے انداز میں ایک عورت کے واردات قلبی اور اس کے جسمانی تناؤ کو بیان کیا ہے۔اسی نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

اسی لیے تو آستیں سے ناک صاف کرتے بچے بھی/نالی پہ بیٹھی لڑکی دیکھ کر بادلوں کی طرح ہنستے ہیں/خواب دیکھتے ہوئے لڑکیاں ڈر جاتی ہیں/اور چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی ہیں/اور لڑکے شیطان کو کنکر مار مار بے حال ہو جاتے ہیں/ہمارے ملک میں بے شرمی کی ممانعت نہیں

کشور ناہید کی شاعری میں مشرقی عورت ضرورت اور استعمال کی چیز،بے حس، بے جان اور غیر فعال شخصیت کے روپ میں نظر آتی ہے۔اس پہلو کی منظرکشی کرتی ہوئی نظم ''بارش میرے اندر'' کے یہ مصرعے دیکھیے:

تمھیں ہمیشہ میرا وجود کھڑکی کی طرح معلوم ہوا ہے/جب چاہا کھولا،نظارے کا لطف کیا/ہوا اور رنگ کو

بدن لباس کیا/اور جب چاہا،طوفان سے بچنے کو/در بند کر کے مجھے اوڑھ کر بیٹھ گئے/ تمھیں ہمیشہ میرا وجود سرنگ کی طرح معلوم ہوا/جب چاہا پناہ لی/جب چاہا سرنگ کو چھپا دیا

کشور ناہید نے مشرقی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے ایک سخت گیر باپ اور گھریلو جھگڑے میں پلنے والی بیٹی کی نفسیاتی واردات کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس کی اہم مثال''اے میرے الزام گرفتہ'' ہے۔انھوں نے میاں بیوی کی لڑائیوں اور ایک دوسرے پر شک کرنے سے بچوں کے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔کشور ناہید نے روایتی معاشرے کی پاسداری کرتی ہوئی عورت کی بے رنگ اور بے رونق زندگی کی عکاسی کی ہے۔انھوں نے گھریلو پدری نظام کے تحت ہونے والے عورت کے استحصال کو بھی موضوع بنایا ہے۔مثنوی کی ہیئت میں لکھی ان کی نظم''اسیں بریاں وے لوکو'' صدیوں سے استحصال کا شکار عورت کی کہانی ہے:

ڈر ڈر دیکھا بدن کو
گندا سمجھا لگن کو
بن بر دیکھے بیاہی گئی
میں سوچوں میں چاہی گئی

کشور ناہید نے متعدد نظموں میں ازدواجی الجھنوں پر بھی بات کی ہے،ان کی اہم نظموں میں''نیلام گھر''،''ترا الٹیا شہر''،''بھنبھور''،''موم محل'' اور''جاروب کش'' شامل ہیں۔انھوں نے نظم''نیلام گھر'' میں مہر کی رسم کو موضوع بنایا ہے اور اس رسم کو عورت کی فروخت کے مترادف قرار دیا ہے:

میرے منہ پر طمانچے مار کر/ تمھارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشاں/ پھولی ہوئی روٹی کی طرح/ میرے منہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں/ تم حق والے لوگ ہو/ تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے

فہمیدہ ریاض کی نظمیں جسارت، بے باکی، بغاوت اور احتجاج پر مبنی ہیں۔ان سے قبل خواتین نظم نگاروں کے لہجے میں اس طرح جسارت اور بے باکی نہیں تھی۔ان کے اولین شعری مجموعے''پتھر کی زبان'' کی نظموں میں ایک جوان لڑکی کو پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔انھوں نے ایک لڑکی خواہش وصل،امید وبیم کی کیفیت ،بے وفائی کا شکوہ اور نارسائی کے احساس کو اپنی ابتدائی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔اس مجموعہ میں شامل زیادہ تر نظمیں رومانوی طرز احساس میں ڈوبی ہوئی ہیں۔فہمیدہ نے نظم''گڑیا'' میں مرد کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے کہ وہ کس طرح ایک کھلونے کی طرح بھولی بھالی لڑکیوں سے کھیلتے ہیں اور جی بھر جانے پر اس طرح لاتعلق ہو جاتے ہیں جس طرح بچے نیا کھلونا دیکھنے پر پرانے کھلونے میں کشش محسوس نہیں کرتے:

چھوٹی سی ہے/اس لیے اچھی لگتی ہے/ بٹوا جیسے ہونٹ ہیں اس کے /اور رخساروں پر سرخی ہے/ نیلی آنکھیں کھولے،بیٹھی تاک رہی ہے/جب جی چاہے کھیلو اس سے/الماری میں بند کر دو/اس کے ننھے لبوں پر کوئی

پیاس نہیں ہے / نیلی آنکھوں کی حیرت سے مت گھبراؤ/اسے لٹادو/ پھر جیسے یہ سو جائے گی/

فہمیدہ ریاض نے ’’ننھے لبوں کی پیاس‘‘ اور’’نیلی آنکھیں‘‘ جیسی نظموں میں بے لوث عشق کی طلب ہے اور مرد کی خودغرضی کا تذکرہ کیا ہے۔وہ عورت کو معاشرے کا ایک اہم کردار سمجھتی ہیں اور اس تصور کو یکسر رد کرتی ہیں کہ عورت کا گوشت پوست سے بنا ہوا خوب صورت انسانی ڈھانچہ مرد کی جنسی آسودگی اور ذریعۂ افزائش ہے۔فہمیدہ ریاض کی نظمیں عورت کے حواس، جذبات اور تجربات کا بے باک اظہار ہیں۔انھوں نے مشرقی تہذیب وروایات سے دب جانے والی عورت کے مسائل کو کھول کر بیان کیا ہے۔ان کی نظمیں ’’باکرہ‘‘اور’’زمین دوز ریل‘‘ عورت کے ان کہے جذبوں کو زبان دیتی ہیں۔عورت کے نقطۂ نظر سے پیوستہ نظموں میں ’’بدن دریدہ‘‘،’’ہاتھ اپنا لاؤ ذرا‘‘ ،’’مقابلہ حسن اور الاؤ‘‘’’آکاس بیل‘‘،’’دوجا سایہ‘‘’’لوری‘‘،’’زمین زبانوں کا بوسہ‘‘،’’وہ ایک زن ناپاک‘‘،’’پچھلے پہر میں‘‘،اور’’آج شب‘‘ شامل ہیں۔فہمیدہ ریاض کے شعری موضوعات کے بارے میں ڈاکٹر ناہید قاسمی رقم طراز ہیں:

> ’’فہمیدہ ریاض کے پہلے مجموعہ کلام میں ’’پتھر کی زبان‘‘ نے اردو شاعری کو ایک تازہ شگفتہ لہجہ عطا کیا تھا۔انھوں نے پہلی بار ایک ذہین اور حساس لڑکی کو بڑے اعتماد سے شاعری کی دنیا میں داخل کیا۔دوسرے مجموعہ کلام ’’بدن دریدہ‘‘ میں انھوں نے ایک عورت کے تجربات کو اپنے ہی انداز میں پہلی بار بیان کیا جب کہ ’’دھوپ‘‘ میں وہ سیاست اور شاعری کو ملا جلا کر پیش کرنے کی سعی کرتی نظر آتی ہیں۔‘‘(۸)

فہمیدہ ریاض نے عورت کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کرنے پر احتجاج کیا ہے اور اسے سماج کا جبر گردانا ہے۔نور جہاں ثروت کو ذاتی زندگی میں نامساعد حالات اور تلخ تجربات سے واسطہ پڑا اس لیے ان کی شاعری میں بے باکی اور تلخی کا عنصر نمایاں ہے۔انھوں نے جس طرح اور جتنے قریب سے زندگی کو دیکھا اور محسوس کیا اسی طرح شاعری میں بیان کر دیا۔انھوں نے ایک عورت کے احساسات، جذبات اور مشاہدات کی سچی عکاسی کی ہے۔ دلّی تہذیب کی پروردہ شاعرہ کے یہاں سماجی اور اخلاقی قدروں کے زوال اور انسان کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کا ذکر ملتا ہے۔نور جہاں ثروت نے اپنی شاعری میں بکھرتے اور ٹوٹتے رشتوں پر بھرپور طنز کیا ہے، انھیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب رشتے بے معنی سے ہو گئے ہیں۔انھوں نے اس سماجی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج رشتے صرف دولت میں تولے جاتے ہیں، ماں باپ کے پاس اگر پیسے ہیں تو بیٹے ان کی خدمت داری کریں گے، بیوی اس وقت تک شوہر سے خوش رہتی ہے جب تک شوہر کے یہاں دولت کی فراوانی ہو، بھائی بہن اور دیگر رشتے دار غریب سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ثروت نے عورت پر ہونے والے تشدد اور امتیازی سلوک کے لیے آواز اٹھائی ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں ماضی کو بڑا یاد کیا ہے اور افسردگی کے لمحوں میں ہمیشہ اپنی یادوں کی کہکشاں سجائی ہے، نظم ’’بازگشت‘‘

ملاحظہ کیجیے:

آج کھویا ہوا مرا بچپن لوٹ آیا ہے/وہی بچپن کہ جو کھیلا تھا/محبت کے حسیں آنگن میں/وقت کی دھوپ نے جھلسایا نہیں تھا جس کو/شفقتیں اس پہ نچھاور تھیں/محبت قرباں/اس کو معلوم نہ تھا/سخت بھی ہوتی ہے زمیں/اور ہوتا نہیں آنچل بھی کوئی/وقت بے رحم ہے سب چھین کے لے جاتا ہے/اور رہ جاتے ہیں یادوں کے/نقوشِ مبہم

عورت کو پیار کے بدلے میں جب پیار نہیں ملتا تو وہ ذہنی ناآسودگی کا شکار ہو جاتی ہے، اسے تشنگی اور محرومی کا احساس باقی رہتا ہے۔نور جہاں ثروت نے اس کا اظہار نظم ''ایک بے شکست رشتہ'' میں کیا ہے، نظم ''جو ہو سکے تو'' میں خوابوں کے شہزادے کے حصول کے لیے خدا سے دعا کی ہے اور نظم ''کرب اجنبیت'' میں مصروف ترین شہری زندگی کی عکاسی کی ہے۔گھر جو چین اور سکون کا محور تھے اب ایک اجنبی سا کرب دیتے ہیں:

عجیب شکل سے ٹوٹے ہیں سلسلے دل کے / کہ اپنا گھر بھی مجھے اجنبی سا لگتا ہے/نہ کوئی خواب یہاں مشترک/نہ تعبیریں/خیالِ خام کی تاویل خوب ہوتی ہے/ کہ سینے چاک ہیں لفظوں کے/نطق پر تالے ہیں/سکوں کا گھٹتا ہے دم/بے حسی کا عالم ہے/یہ میرا گھر ہے تو کیوں اجنبی سا لگتا ہے

نور جہاں ثروت نے طویل نظم ''اپنے لیے جیو'' میں عورت کے جذبات واحساسات، دردوکرب اور مرد کی طرف سے عورت کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔نور جہاں ثروت کی شاعری میں روح عصر نظر آتی ہے۔شبنم شکیل کی فکر انگیز نظمیں سماجی مسائل اور نسائی احساسات کی سچی عکاس ہیں۔انھوں نے عورت کی باطنی کیفیات اور سماجی رویوں کی کشمکش کو بیان کیا ہے لیکن ان کا رویہ زیادہ باغیانہ انداز کا نہیں۔انھوں نے عورت کی نفسیاتی کیفیت بیان کرنے میں نہایت حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو ہو بہو پیش کر دیا ہے۔شبنم شکیل کی شاعری میں مشرقی معاشرے کے جبر اور ستم سہنے والی معتدل رویے کی حامل خاتون دکھائی دیتی ہے۔ان کے کومل نسائی لہجے کی حامل نظموں میں ''بانجھ پن کی بددعا'' اور ''آبِ حیات'' زیادہ اہم ہیں۔ان کی شاعری میں عورت اپنے روزمرہ کے فرائض سے بندھی، معاشرتی قدغنوں میں گرفتار اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار نظر آتی ہے۔انھوں نے عورت کی بے بسی، مظلومیت اور محکومیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے عورت کے دونوں روپ پیش کیے ہیں۔عورت بیوی اور طوائف دونوں طرح مرد کے اشارے پر ناچتی ہے، اس کی مثال نظم ''ایک دفعہ کا ذکر ہے'' دیکھیے:

ملی تھی مجھ کو اک بوڑھی طوائف ایک محفل میں/جو خود پیشہ نہیں کرتی تھی، اک چکلا چلاتی تھی/مرے جیسی گھریلو بیویوں کے دل جلاتی تھی/تھی اس کے ساتھ اک من موہنی سی نوجواں لڑکی/جو اس رنگین محفل میں برائے رقص آئی تھی/ کہ صاحب خانہ کو صورت اس البیلی کی بھائی تھی/یونہی بس اتفاقاً دونوں میرے پاس آ بیٹھیں/بہت ہی زعم میں تھی میں کہ اپنی پاکبازی کے/ذرا سی دیر میں اوقات ان کی ان کو سمجھا دی/بہت سا بوجھ لے کر پھر رہی ہو تم گناہوں کا/یہ سن کے رنگ جیسے اڑ گیا لڑکی کے چہرے کا/ندامت سے سر اس کا جھک گیا بھر آئیں آنکھیں بھی/ مگر

بڑھیا جو ناچ اوروں کو تگنی کا نچاتی تھی/ تاثر لینے والی تھی بھلا وہ ایسی باتوں کا/ مرے کانوں میں پھر بولی وہ سرگوشی کے لہجے میں/ یہاں ناچنا پڑتا ہے سب کو پیٹ کی خاطر/ ہمیں غیروں کے آگے تم کو شوہر کے اشاروں پر

شبنم شکیل نے مشرقی عورت کی نفسیات، خواہشات اور احساسات کو انتہائی کامیابی سے شعری پیکر دیا ہے۔ انھوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں ایک جہیز کی رسم بھی ہے۔ جدید اُردو نظم کی جواں مرگ شاعرہ پروین شاکر، فہمیدہ ریاض کے ابتدائی کلام سے کافی متاثر تھیں لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا منفرد نسائی لہجہ ہے۔ ان کے پہلے مجموعے میں ساحل، سمندر، ہوا، گیلی ریت، لہریں اور بادبان کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ انھوں نے عورت کے خوابوں، احساسات، جذبات اور کچی عمر کی ذہین اور حساس لڑکی کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ''صد برگ'' کی نظموں میں پروین کا عصری شعور سنجیدہ اور بامعنی دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے عورت کے دکھ اور مسائل کو مشاہدے سے نہیں بل کہ اپنے ذاتی تجربے سے بیان کیا ہے۔ انھیں محکومی اور سماجی پابندیوں میں جکڑی ہوئی عورت کا احساس ہے، اس لیے وہ تتلی بن جانا چاہتی ہیں۔ نظم ''میں تیتری رہنے میں خوش ہوں'' ملاحظہ کیجیے:

اور مجھے یہ خبر ہے/ کہ میں اک دفعہ/ ہاتھ اس کے اگر لگ گئی/ وہ مکھی بنا کے مجھے/ اپنی دیوار خواہش سے تا عمر اس طرح چپکائے رکھے گا/ کہ میں/ روشنی اور ہوا اور خوشبو کا/ ہر ذائقہ اس طرح بھول جاؤں گی/ جیسے کبھی ان سے واقف نہ تھی/ سو میں تیتری رہنے میں ہی بہت خوش ہوں

پروین شاکر نے نہ صرف رومانی کیفیات کو بیان کیا ہے بل کہ سماجی مسائل کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے، اس بارے میں راحت ملک لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ ''خوشبو'' سے ''انکار'' تک کا سفر خود شاعرہ کے فکر و فن، شعور و آگہی، فرد سے سماج کے باہمی رشتوں اور تصادم سے ابھرنے والی تلخ حقیقتوں کے ادراک اور اظہار کا ارتقا بھی تھا اور سفر بھی...... پروین محض نسوانیت کی شاعرہ نہیں پوری انسانیت کی شاعرہ ہے۔ وہ رومانیت ہی کی نہیں عقلیت کی بھی شاعرہ ہے۔''(۹)

پروین شاکر کی آخری نظمیں زیادہ فکر و احساس کی حامل ہیں۔ وہ ترقی پسند رجحان بھی رکھتی ہیں، ان کی شاعری رومانیت اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے مردانہ جرأت و جسارت بھی کی ہے اور کبھی کبھی کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی طرح حدِ تانیثیت سے تجاوز بھی کی جاتی ہیں۔ انھوں نے لڑکیوں کے اندرون میں پنپنے والے جذبات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ پروین شاکر نے اپنے شعری مجموعہ ''خوشبو'' میں نوعمر لڑکی کے عشقیہ جذبات، تموج اور معاشرے کے جبر کو بیان کیا ہے۔ نظم ''صرف ایک لڑکی'' ایک ایسی لڑکی کی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے جو سماجی ضابطوں اور رواجوں کی وجہ سے اپنے محبوب کا قرب حاصل نہیں کر سکتی اور وصل کی خواہش سے لبریز اس کی بے قرار نسوانیت معاشرے کے بے آہنی حصار توڑ دینا چاہتی ہے:

کاش میرے پر ہوتے/ تیرے پاس اُڑ آتی/ کاش میں ہوا ہوتی/ تجھ کو چھو کے لوٹ آتی میں/ مگر کچھ بھی/ سنگ دل رواجوں کے/ آہنی حصاروں کے/ عمر قید کی ملزم/ صرف ایک لڑکی ہوں

ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے جذبات اور خیالات کی قدر نہیں کی جاتی اور نہ ہی انھیں کسی فیصلے کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ پروین شاکر نے اس رویے کی مذمت کرتے ہوئے آزادیٔ نسواں کے لیے آواز بلند کی ہے۔ یہ رویہ کسی بھی لڑکی کے والدین سے شروع ہوکر شوہر اور سسرال تک جاتا ہے۔ اس کی مثال نظم ''نک نیم'' میں ملاحظہ ہو:

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو/ ٹھیک ہی کہتے ہو......! کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں/ جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا/ میرا کوئی رنگ نہیں/ جس بچے کے ہاتھ تھما دو/ میری کسی سے جنگ نہیں/ تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو/ ٹھیک ہی کہتے ہو!

فاطمہ حسن نے ایک لڑکی کے سینے میں جنم لینے والی معصوم خواہشوں اور درد کو الفاظ دیے ہیں، ان کی شاعری میں ان کا وجود اور روح عصر بولتا ہے۔ ان کی شاعری میں ادھوری لڑکیاں لان میں بچھی ہوئی کرسیوں کی طرح اوس میں بھیگ رہی ہیں، یہ لڑکیاں کسی کی پناہ میں آنا چاہتی ہیں، نظم ''انتظار'' اس کیفیت کی مثال ہے۔ فاطمہ حسن نے ایسی لڑکی کی کیفیت بیان کی ہے جو اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے اور اپنی کسی خواہش کا اظہار نہیں کر پاتی کیوں کہ اسے سماج کے ضابطے اچھی طرح یاد ہیں۔ فاطمہ حسن نے پھولوں کی خواہش من میں سجانے والی لڑکی کی کیفیت کا اظہار نظم ''دعا'' میں کیا ہے۔ عورت اگر ایک بار کسی کی ہو جائے تو عمر بھر اس کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھا لیتی ہے جب کی مرد اسے جنسی آسودگی کا ایک پل سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ فاطمہ حسن نے نظم ''تعاقب'' میں اپنے محبوب کی بے مروتی اور مرد کے منافقانہ رویے کا ذکر کیا ہے:

تتلیوں کی طرح تمھارے/ تعاقب میں اُڑنے والی آنکھیں/ اب سمندر میں ڈوب جانا چاہتی ہیں/ اور کنول اُن کا سہارا بننے کی کوشش میں/ کناروں سے دور کر رہے ہیں/ اس سفر میں کہیں ہاتھوں کا رنگ ہی نہ کھو جائے/ جو کینوس پر بکھیر کر میں/ اس تتلی کو قید کر لینا چاہتی تھی/ میں تمھارے گرد اُڑ کر/ تمھارے وجود میں گم ہو جانا چاہتی تھی/ تم مجھے لہروں کے حوالے کر کے/ خود سایوں کے جنگل میں/ کھو گئے ہو

فاطمہ حسن نے نظم ''انجانا خوف'' میں اس لڑکی کے جذبات کی عکاسی کی ہے جو اس مردانہ اور پدری نظام پر مبنی معاشرے سے خائف رہتی ہے۔ ''بہتے ہوئے پھول''، ''دستک سے در کا فاصلہ'' اور ''یادیں بھی اب خواب ہوئیں'' میں فاطمہ حسن ایک لطیف رومانوی لہجہ کی شاعرہ کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ پروین شاکر کی طرح فاطمہ حسن کی شاعری میں بھی رومانوی طرزِ احساس کی وجہ سے حقیقت کا رنگ زیادہ تلخ اور کڑوا نظر نہیں آتا۔ ان کی نظمیں کچی عمر کی لڑکی کے جذبات سے لے کر معاشرتی شعور کی حامل عورت کی سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ اس حوالے سے ''شی بدھا''، ''میں''، ''ایک لڑکی''، ''ہوا کی صورت زندہ رہ سکتی ہوں''، ''زندگی خواب جیسی حقیقت ہے''، ''ایک

خواف'' اور'' بہتے ہوئے پھول'' زیادہ اہم ہیں۔نظم''سگ گزیدہ'' فاطمہ حسن نے جون ۲۰۰۳ء میں پنچایتی حکم پر گینگ ریپ کا نشانہ بننے والی لڑکی مختاراں مائی کے ساتھ پیش آنے والے المناک واقعہ کو بیان کیا ہے:

روتی ہوئی اک لڑکی/اور چاروں جانب کُتے/دوڑ لگاتے غراتے/رالیں ٹپکاتے/ٹوٹ پڑے اُس لڑکی پر/رومت لڑکی/سوچ کی اُن ماؤں نے/ کن کتوں کے نطفے سے/جنم دیا تھا اُن کو/وہ بھی کیسی سزائیں کاٹ رہی ہیں۔

فاطمہ حسن نے گلی کوچوں میں روز گزرتی ہوئی لاشوں، بلند ہوتی ہوئی چیخوں اور دیگر ملکی حالات کا ذکر کیا ہے۔ان کی شاعری میں پھول، پیڑ، پرندے، بچے، مچھلیاں، تتلیاں، برسات کی رم جھم، دھنک اور چوڑی کی کھنک جیسے الفاظ امن، سکون، محبت، خوب صورتی، حسن فطرت اور بہتر مستقبل کی علامات ہیں۔ثمینہ راجہ رومانی طرز احساس ،جذباتی نشیب وفراز ،عصری رویوں اور فیمینزم کی بڑی باکمال شاعرہ ہیں۔ انھوں نے اپنے غم ،کرب، تنہائیوں، نارسائیوں اور محرومیوں کو بیان کرتے ہوئے دوسری عورتوں کو بھی شریک کرلیا ہے۔ان کا انفراد یہ ہے کہ انھوں نے عورت کے احساسِ محرومی کو بیان کرتے ہوئے شاعری کو بین میں نہیں بدلا اور نہ ہی اسے ہنگامہ وآشوب بنایا ہے بل کہ مدھم اور سرگوشی کے لہجے میں بات کی ہے اور نہ ہی انھوں نے بدن کے موضوع کو جنسی لذت وآسودگی بننے دیا ہے۔ثمینہ راجہ نے نوخیز لڑکیوں کے خوابوں اور جذبات سے لے کر ایک پختہ عمر کی باشعور عورت کی نفسیات کے بھید اپنی شاعری میں کھولے ہیں۔انھوں نے سرمایہ دار طبقے کی مذمت کی ہے جنھوں نے اپنی اشیا مہنگی بیچنے کے لیے عورت کو اشتہار اور پوسٹروں کی زینت بنایا ہے۔ثمینہ راجہ کی نظم''سمندر سے کہو'' عورت کی نمائش کے بارے میں ہے۔

کہیں مردانہ پدری نظام معاشرت ،کہیں مذہبی عقائد اور کہیں مشرقی رواجوں کی پابندیاں عورت کو جکڑے ہوئے ہیں اس لیے وہ سخت جذباتی بحران کا شکار ہے۔اسلام نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے مرد ایک وقت میں چار شادیاں کرسکتا ہے۔عورت ایسی باتیں سوچتی تو ضرور ہے لیکن دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے ڈر سے اندر ہی اندر گھٹتی رہتی ہے۔عورت کبھی کبھی مرد کی زندگی سے متعصب بھی ہو جاتی ہے، پردہ اگرچہ عورت کی زینت ہے لیکن وہ متعصب ہوکر سوچتی ہے کہ ہمیں پردوں میں رکھا گیا ہے اور مرد کو معاشرہ کچھ نہیں کہتا۔اس سارے منظر کی عکاسی کرتی ہوئی نظم''Play Boy'' ملاحظہ کیجیے:

مکے مدینے سے/تسبیح اور جانماز ہمارے لیے/ مگر زندگی تو خود/منہ سے بولتی ہے/ کب تک اس کی آواز پر/''سنائی نہیں دیتا'' کا بہانہ/ کب تک کھڑکیوں کے شیشوں پر/بھاری پردے/تازہ ہوا کی روک تھام کے/منصوبے/اور تمھارے سرہانے شیلف میں/مادرزاد برہنہ/ گوریاں بھری پڑی ہیں

ثمینہ راجہ کی شاعری میں استعاروں اور تمثالوں میں چھپے ہوئے موضوعات عورت کے نفسیاتی بحران ،خوف اور رشتوں پر عدم اعتماد جیسی فضا کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کی نظموں میں محبت، جذبات اور روحِ عصر کی عکاسی

کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''ان (ثمینہ راجہ) کی شاعری میں ذات کے ساتھ ساتھ پوری کائنات کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں،جن پر محبت کا جگمگا تا ہوا رنگ غالب ہے......شدید حساسیت اور جدید حسیت ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کی تمام تخلیقات جادو کا سا اثر رکھتی ہیں اور ان میں روحِ عصر کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔''(۱۰)

ثمینہ راجہ نے ایک لڑکی کے وسوسے،ایک ماں کے اندیشے اور ایک بیوی کے خدشے بیان کیے ہیں،سماج میں طبقاتی تقسیم کی عکاسی کرتی ہوئی ایک نظم ''آسمان کے نیچے'' دیکھیے:

بیگم صاحب! باہر دھوپ بہت ہی تیز ہے/پیاس لگی ہے،تھوڑا ٹھنڈا پانی دے دو/ساتھ میں روٹی کا ٹکڑا بھی مل جائے تو اچھا ہوگا/بچہ دن بھر سے بھوکا ہے/ کمرے میں کتنی ٹھنڈک ہے بیگم صاحب!/ کمرہ ٹھنڈا کرنے والی،پانی ٹھنڈا کرنے والی/ساری مشینیں کتنے پیسوں میں آتی ہیں؟/صبح سویرے/سارے مردوں عورتوں کو مزدوری پر جانا ہوتا ہے/دیر سے پہنچیں تو مزدوری کب ملتی ہے/سنا ہے اپنا بادشہ ایک نیا آیا ہے/پہلا بادشہ جیل میں ہے/پھر بیگم صاحب،آٹا سستا کیوں نہیں ہوتا؟/خیر ہمیں کیا،کوئی آئے،کوئی جائے/ہم کو تو جنگل سے لکڑی چُن کر لاتے/پانی بھرتے،ساری عمر گزارنی ہے

ثمینہ راجہ کی شاعری کثیر الجہت موضوعات کی حامل ہے،اس میں کائنات کے سارے رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی نظموں میں عورت کی داخلی کیفیات اور روحِ عصر کو موضوع بنایا گیا ہے۔شاہین مفتی نے اپنی شاعری میں حالات کی تلخیاں بیان کی ہیں لیکن زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کے سامنے پسپائی اختیار نہ کی۔ان کے کلام میں تنہائی،اداسی اور مایوسی کی انتہا ہے،ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہے،ان کی شاعری میں داخلی کیفیات کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔نظم ''جاگتی رتوں کے عذاب'' میں شاہین کی اداسی اور مایوسی ملاحظہ کیجیے:

شاہین مفتی ایک عورت کے دل کی اداس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اپنے ذاتی تجربے سے گزرتی ہے تو اجتماعی طرزِ احساس کی حامل لگتی ہے۔اس نوع کی اہم نظموں میں ''آنکھوں کا عذاب''،''ہجرت کی ایک نظم''،''عجیب رت ہے''،''امربیل''،''ہوا محل''،''کایا کلپ'' اور ''تم ساون کا پاگل چھنٹا'' شامل ہیں۔ان کی نظموں میں ایک نادیدہ سی خواہش تیرتی پھرتی ہے۔ان کی شاعری میں چاند،ستارے،دریا،پہاڑ،پھول،خوشبو،بہار اور خزاں کے حوالے ملتے ہیں۔ان میں بعض عناصر کو انھوں نے کوئی سماجی حقیقت بیان کرنے کے لیے بہ طور استعارہ استعمال کیا ہے اور بعض عناصر کے استعمال کا مقصود صرف فطرت کے مناظر کی عکاسی کرنا ہے۔نظم ''خالی پنجرہ'' ملاحظہ کیجیے:

شاہین مفتی کی نظمیں ان کے نسوانی پن،گہرے مشاہدے اور تجربے کی آئینہ دار ہیں۔وہ نا امید نہیں،وہ حرکت،عمل اور زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتی ہیں۔شاہین مفتی عورت کو دکھ اور کرب سے ٹوٹنا نہیں بل کہ دکھ سہنا

سکھاتی ہیں۔منصورہ احمد، سادہ طرزِ اظہار کی حامل ہیں، امیجری اور علامت نگاری نے ان کی شاعری میں نکھار پیدا کر دیا ہے۔شاہین مفتی کی طرح ان کی شاعری پر بھی اداسی اور مایوسی کی فضا چھائی ہوئی ہے، مگر کہیں کہیں امید کی کرن بھی نظر آتی ہے۔ان کی نظموں میں پھول، تتلی اور خوشبو کا ذکر ذرا کم ملتا ہے۔انھوں نے زیادہ تر آنگن کے دشت کی منظر کشی کی ہے۔ان کی شاعری مشرقی روایات کی آئینہ دار ہے۔مشرقی روایت اور آنگن سے جڑی ایک نظم دیکھیے :

یاد ہے بابل/جب ساون میں برکھارت کی جل تھل سے/ آنگن اور گلیارے جھیلیں بن جاتے تھے/تب تم مجھ کو کاغذ کی اک ناؤ بنا کر دیتے تھے/جس پر بیٹھ کے میں پریوں کے/اور پھولوں کے خواب نگر ہو آتی تھی/ کاغذ کی وہ ناؤ اب تو بھیگ گئی ہے/اور اس کے میرے رستے میں/اندھی کالی موجوں والے/سات سمندر پڑتے ہیں/اک بھیگی ناؤ پر آخر سات سمندر کیسے پاٹوں؟

منصورہ احمد کی شاعری میں گھر، آنگن، دشت، ساون، جگنو، آندھی اور سمندر کا خوب ذکر ملتا ہے، وہ اداسی کے اظہار کے لیے موسموں کی عکاسی کرتی ہیں، نظم ''سنو'' اس حوالے سے اہم ہے۔منصورہ احمد سماجی رویوں پر بھی نظر رکھتی ہیں، انھیں اردگرد کے ماحول سے بھرپور آگہی حاصل ہے۔ان کی شاعری میں مشرقی دوشیزاؤں کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جنھیں اپنی امنگوں اور خوابوں کے لیے کیا کیا ستم سہنے پڑے۔عہد جدید میں آج بھی صدیوں پرانی رسمیں ہیں جس پر منصورہ احمد حیرت کا اظہار کرتی ہے، انھوں نے معاشرتی مسائل کی عکاسی علامتوں کے ذریعے کی ہے۔

نسیم سید، عرصہ دراز سے بیرون ملک مقیم جدید اردو نظم کی اہم شاعرہ ہیں، ان کی شاعری نسائی لہجے کو خالص انسانی حقیقت میں تبدیل کرتی ہے۔انھیں معاشرتی جبر کے خلاف کمربستہ ہونے والی شاعرات میں اہم مقام حاصل ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''آدھی گواہی'' ایک بے بس، مظلوم اور استحصال کا شکار عورت کی داستان ہے۔نسیم سید نے نظم ''جہیز'' میں شادی شدہ خواتین کو درپیش مسائل کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکی کی تربیت میں یہ بات شامل کر دی جاتی ہے کہ وہ پرایا دھن ہے، وہ شادی کے بعد اپنے شوہر اور سسرال سے مزاجی مطابقت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔نسیم سید کی نظم ''عصا کی حاجت نہیں ہے مجھ کو'' انھی حالات کی عکاس ہے۔اس نوع کی دوسری اہم نظموں میں ''سانولیرنگ''، ''ڈاروی''، ''سارا''، ''مالک'' اور ''ایشیا کی مزدور عورت'' شامل ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں گاؤں کی کسان عورت اور شہر کی کلرک عورت کی زندگی کی عکاسی کی ہے کہ ان کی جوانی مشقت کرتے کرتے ڈھل جاتی ہے لیکن کام کبھی ختم نہیں ہوتا، یہاں تک کہ یہ لوگ فطرت کی خوب صورتی کا نظارہ بھی نہیں کر پاتے۔اس موضوع کی ایک نظم ''تم سے ممکن ہو تو پھر'' دیکھیے :

تم مرے گاؤں میں آ کے دیکھو/ جیٹھ کی دھوپ میں وہ دھوپ بدن/ پھول ہاتھوں میں درانتی تھامے/ کچی عمروں سے جواں خوابوں تک/ خواب کی عمر سے بوڑھے سر تک/ دھانی فصلوں پہ جھکتے رہتے ہیں/ تم میرے شہر میں آ کے دیکھو/ کارخانوں میں مرے ساتھ چلو/ کسی دفتر، کسی مکتب، کسی تحقیق کے مرکز میں چلو

نسیم سید کی شاعری میں جہاں حقیقت کی تلخیاں ملتی ہیں وہاں کچھ شیریں لہجے کی جھلک بھی نظر آتی

ہے۔رومانوی طرز احساس کی ایک نظم ''پو پھٹے کا منظر'' اس حوالے سے اہم ہے۔نسیم سید نسائی شاعری کی ایک توانا آواز ہیں،انھوں نے عورت کی خواہشات کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔صادقہ نواب سحر نثر اور شاعری میں یکساں تخلیقی صلاحیت رکھتی ہیں،ان کی شاعری میں عورت پر ہونے والے ظلم وستم پر زیادہ احتجاج تو نہیں ملتا بلکہ وہ یہ جنگ پیار محبت سے جیتنا چاہتی ہیں۔انھوں نے سماجی وسیاسی مسائل کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔صادقہ نے عورت کے درد وکرب کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ عورت ساری زندگی اپنے مرد کو خوش کرنے میں لگی رہتی ہے اور ہر کام اس کی مرضی کے مطابق کرتی ہے،نظم ''ہم روئیں کب'' ملاحظہ کیجیے:

سب کو ہنسا کر خوش ہوتے ہیں/یہ بتلا ہم روئیں کب/سپنے بنتے بنتے آنکھیں تھک جاتی ہیں/ بکھری زلفیں بھیگی آنکھیں/ غم کی مورت بن جاتی ہیں/ من ہی من میں تجھ کو پوجا/ لیکن ہم نے کیا پایا/ تجھ کو اپنا سب کچھ سمجھا

عورت کے سینے میں بے شمار خواہشیں جنم لیتی ہیں لیکن وہ سماج کے بے جا بندھنوں کی وجہ سے ان تک رسائی نہیں پا سکتی اور خود کو مجبور محض سمجھتی ہے۔صادقہ نواب سحر نے اس کیفیت کی ترجمانی ''پتھروں کا شہر'' میں کی ہے۔انھوں نے سماج میں پنپنے والی غربت کا ذکر کیا ہے کہ غریب بچے دودھ کے لیے ترس رہے ہیں اور کوئی ان کی مدد کو تیار نہیں۔دور حاضر میں غریب بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔عورت اندر سے خواہ جتنی بھی ٹوٹی اور بکھری ہوئی کیوں نہ ہو اپنے شوہر کو محبت دیتی ہے وہ اپنا دکھ درد چھپا کر اپنے محبوب کو خوشی کے گیت سناتی ہے۔صادقہ نواب سحر نے عورت کو سراپا محبت قرار دیا ہے۔

صادقہ نواب سحر کی نظمیں محبت اور رواداری کو فروغ دیتی ہیں۔ہندوستان میں مسجد،مندر اور گرجا گھر کسی چیز کی بھی کمی نہیں پھر کبھی مذہب،کبھی بھاشا اور کبھی کسی نام پر لڑائی کیوں ہوتی ہے۔جب اس ملک میں گورے کی حکمرانی تھی تب بھی یہ مذہب یہ بھاشا یہ رسمیں الگ تھیں تب ہندوستانی ایک دوسرے کو گلے لگاتے تھے اور آپس میں مل کر چلتے تھے اور گورے سپیرے کی غلامی سے نجات پائی تھی اب کیا ہو گیا ہے۔صادقہ نواب سحر نے ہندوستانیوں کو امن،سکون اور باہمی اتفاق سے رہنے کو کہا ہے۔ہندوستان کے کسان بیچارے ساہوکاروں سے سود پر قرض لیتے ہیں اور وہ بھی نہیں اترتا اور بھوک افلاس سے تنگ آکر وہ خودکشی پر مجبور ہوتے ہیں۔نظم ''کیا کرتے'' ملاحظہ کیجیے:

آندھر مہاراشٹر کے کھیتوں میں/صدائیں گونجیں/ کچھ دیے اور بجھے/اپنی عزت کو سنبھالے ہوئے/دو جسم کٹے/اور دو جسم جلے/پوچھ لو روح سے ان کی / کہ ہوا ایسا کیا؟/ کس لیے جان سے پیاروں کی نکالی جانیں/ قرض کے بوجھ نے زندوں کو کیا مردہ/ پیسوں کی تنگی سے بیٹی بھی بیاہی نہ گئی/ زندگی بوجھ ہوئی/ جینے کی ہمت بھی گئی

عذرا پروین نے اپنی شاعری میں عورت کی خودمختاری اور آزادی کے لیے آواز اٹھائی ہے۔عورت کو مرد اساس معاشرے میں کبھی ذہنی سکون نہیں ملا اس کی اپنی مرضی اور چاہت کوئی معنی اور اہمیت نہیں رکھتی۔عورت آج بھی مرد کے اشاروں پر ناچ رہی ہے،اس کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ مرد کے کام میں مداخلت کرے یا اپنے فیصلے

شوہر، باپ یا بھائی کے بغیر کرے۔ مرد ہی عورت کے جسم و جاں کا مالک ہے۔ عورت کی اپنی کوئی پہچان، آواز اور تشخص نہیں، اس مرد اساس معاشرے نے عورت کا تشخص بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ وہ لڑکی ہو تو اسے گڑیا کہا جاتا ہے۔ عذرا پروین کی نظمیں ہندوستان کے سارے علاقوں کے لوگوں کی بے چارگی، بے بسی اور ان پر ہونے والے تشدد کی عکاس ہیں۔ ''بارہ قباؤں کی سہیلی'' کا یہ شعری اقتباس دیکھیے:

یہ بچہ بھارت ہے نیا بھارت/ابھی چھوٹا ہے/ آنکھ بابری مسجد کے ملبے نیچے کھلی/یہ بچہ بھارت/سورت میں اک جلتی بھٹّی میں/ چکن تندور کرنے والی سلاخ میں کب سے سیخ ہو رہا ہے/ تندوری بھارت زندہ ہے/ دیکھنے کے لیے سورت میں زندہ گلے میں جلتے ٹائر ڈال کے ننگے بدن کا رقص/ جلتی دوڑائی گئی ننگی عورتوں کا نام بھارت ہے

عذرا پروین نے اس نظم میں ہندوستان کے علاقے سورت میں اقلیتی طبقے پر ہونے والے ظلم و تشدد کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ عذرا پروین نے اسی نوع کی دوسری نظم ''میں ہندوستان میں ہوں میں بھارت ہوں'' میں استعاراتی لہجے کا استعمال کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف خطوں اور ریاستوں کو تباہی کے دہانے پر دکھایا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی اور عصری شعور کی جھلک بھی نظر آتی ہے:

میں خون میں لت پت دلّی ہوں/ میں آگ میں لپٹا سورت ہوں/ میں بد بو دیتا ملیانہ/ میں اشکوں روتا میرٹھ ہوں/ میں بھاگل پور کا آنسو ہوں/ میں خوف بدایوں، بھیونڈی ہوں/ گجرات مرا برباد ہوا/ کشمیر لٹا، پنجاب کھنچا/ سب نقش مرے برباد ہوئے/ مرے نغمے محض فریاد ہوئے/ اب کون مجھے جوڑے آ کر/ ہر ہاتھ بڑھے توڑے آ کر

عذرا پروین کی نظموں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کی عورت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، انھوں نے عورت کے ذہنی اور اعصابی کرب کو کہیں جارحانہ، کہیں تلخ اور کہیں طنز طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم ''مجھے مت شارپ کرو'' میں ''پنسل'' عورت کی علامت اور ''شارپنر'' مرد کی علامت ہے۔ مرد عورت کو استعمال کرتا ہے اور شارپنر سے پنسل کی طرح شارپ کر کر کے اس کی حیثیت ختم کر دیتا ہے۔ عذرا پروین نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کی عکاسی کی ہے، انھوں نے طلاق شدہ عورتوں کے کرب اور ان کے ساتھ پیش آنے والے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور ''فیشن چینل'' کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر ہندوستانی تہذیب پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے مغرب سے مرعوب ہوتی ہوئی ہندوستانی تہذیب پر کاری ضرب لگائی ہے، عذرا پروین نے انتہائی درد مندی اور سلیقگی کے ساتھ جنسی استحصال کا شکار ہونے والی عورت کی ترجمانی کی ہے، عورت کے جنسی استحصال پر ان کی ایک طویل نظم ''مردہ عورت کی زندہ ڈائری'' اہم ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری میں وادیٔ کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے گہرے رنگ ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے حقائق اور مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے شاعری میں انسان کے دکھ درد کو سمیٹا ہے اور عورت کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس سلسلے کی ایک نظم

ملاحظہ ہو:

میں گھر سے / کسی دوسرے کی نہیں / بلکہ اپنی تلاش میں نکلی تھی / اور تمھارا / ہر سبق تمھارے بارے میں تھا / تم نے / میری آنکھوں میں / چاندی کے سکوں کا کاجل لگایا / تا کہ میں دیکھ نہ سکوں آسماں کے چھوتے ہوئے / لامحدود راستوں کو / تم نے اپنے وجود کی / ساری کڑواہٹوں کو نچوڑ کر / میرا گلاس بھر دیا / اور اس کڑوے رس کو پی کے

شبنم عشائی نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''اکیلی'' میں اپنی تنہائی کے درد و کرب کو بیان کیا ہے کیوں کہ زندگی میں انھیں کوئی ایسا آدمی نہ ملا جس کو وہ اپنا جیون ساتھی بناتیں:

اگر تمھارے ہزار پیڑوں میں سے / ایک میں بھی ہوتی تو / ایک سال میں / چھ اسپرے، ایک کھاد / اور تمھاری ہزاروں چاہت بھری نظریں / مجھے نصیب ہوتیں اور تب / دل سوگوار نہ ہوتا / میری ہر ٹہنی / تم اپنے ہاتھوں تراشتے / میں سنور جاتی

شبنم عشائی کو زندگی میں اکیلے پن کا تلخ تجربہ رہا۔انھوں نے اپنی شاعری میں مرد اور عورت کے رشتے کا ذکر کیا ہے، وہ ساری زندگی اپنے محبوب سے فاصلہ کم نہ کر سکی۔ ہمارے خاندان میں یا سماج میں جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اسے وفاداری اور تابعداری کا سبق دیا جاتا ہے، اس نے ساری زندگی چابی دی ہوئی گڑیا کی طرح مرد کی مرضی اور چاہت کے مطابق رہنا ہوتا ہے، اس حوالے سے شبنم عشائی کا یہ شعری اقتباس دیکھیے:

وہ جب پیدا ہوئی تھی / اس کے کانوں میں / تابعداری کی اذان دلوائی گئی تھی / جب سے اب تک / تابع داری کرتی رہی / وہ راہ چلتے رک جاتی / جس طرف چلنے کا اشارہ ہوتا / چلتی رہتی / رکنے کو کہا جاتا / رک جاتی

شبنم عشائی نے اس نظم میں عورت پر سماجی بندھنوں میں بندھے رہنے کا ذکر کیا ہے۔شبنم عشائی کی شاعری عورت کے سچے جذبات اور احساسات کی عکاس ہے، محمود ہاشمی، شبنم عشائی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شبنم کی شاعری صرف ایک عورت کی شاعری نہیں ہے۔ایک ایسے وجود کی شاعری ہے جس نے اپنے عہد میں زندگی کے نشیب و فراز کو بھوگا ہے۔شبنم کا وجودی اظہار تانیثیت کے اس ادب کا واضح ثبوت ہے جس میں عورت کی خودی، اس کا اظہار اور اس کی بغاوت، مرد کی شاعری سے مختلف ہو جاتی ہے۔''(۱۱)

وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ترنم ریاض کی شاعری میں قدرتی مناظر اور پرندوں کی جھلک نظر آتی ہے۔انسانی رشتوں میں انھوں نے ماں اور بچے کے رشتے کا ذکر زیادہ کیا ہے۔زندگی کی چھوٹی چھوٹی کیفیات، تجربات اور محسوسات کو اپنی نظموں میں سمیٹا ہے۔ان کی شاعری میں قدرت اور زندگی ہم آمیز دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم ''بلبل'' میں بلبل کے سریلے نغموں کی ستائش کی ہے کہ بلبل کس طرح ہماری اداسی کو نغموں میں بدلتی

ہے اور خود پیڑوں کی گھنی شاخوں میں چھپی بیٹھی ہے۔’’چھٹیاں‘‘ اور’’سیاہ آسمان‘‘ میں بھی ترنم ریاض نے مناظر فطرت کو بیان کیا ہے۔عورت جب بیٹی ہوتی ہے تو گھر باپ کا ہوتا ہے اور اسے اپنے ہی گھر میں پرایا تن، پرائی امانت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بھائیوں نے بھی اسے محبت نہیں دی اور اپنی شخصیت کے ٹکڑے کر کے اولاد جنی، کتنی راتیں اس کے لیے تڑپی اور جاگی۔ترنم نے اپنی نظموں میں خدا سے چند گلے شکوے کیے ہیں۔انھوں نے عورت کے تشخص کو منوانے کے لیے خدا سے التجا کی ہے کیوں کہ عورت کا تشخص پائمال ہوتا جا رہا ہے۔نظم’’مرد‘‘ میں ترنم ریاض نے مرد کی جنسی ہوس کی طرف اشارہ کیا ہے:

اس نے مطلب کی خاطر کیا استعمال/ بیچتا بھی رہا اور خریدا کیا/شیشۂ دل کو توڑا بدن کے لیے/ پھر بدن کو بھی چھوڑا کسی دوسرے تیسرے تن کی خاطر/ کہ اس کی تلاش اب بھی جاری ہے/اور/ جانے کب تک یہ جاری رہے گی ابھی

ترنم ریاض کی متعدد نظموں میں ایک عورت اور ایک ماں ہی چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔نظم’’ایک ہی جذبہ‘‘ میں انھوں نے ایک ماں کے سچے جذبات اور احساسات کو پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ماں ایک دردمند ہستی ہوتی ہے جس کا دل اپنی اولاد کے لیے تڑپتا ہے۔ترنم ریاض نے عورت کی مجبوری اور بےبسی کی آواز اپنی شاعری میں اٹھائی ہے۔انھوں نے مرد کی بے وفائی کا جواب بڑے حوصلے اور بے باکی سے دیا ہے۔نظم’’چاہتوں کے گلاب‘‘ ملاحظہ کیجیے:

چل دیے چھوڑ کر اگر تم تو/ ختم ہوتی نہیں ہے دنیا یہیں/ زندگی ایک بار ملتی/ آہ بھر کر نہ وقت کبھی کاٹوں گی

ترنم ریاض کی متعدد نظمیں رومانوی طرز احساس کی حامل ہیں۔انھوں نے ماضی کے دنوں کو یاد کیا تو تلخیاں کم ہوئیں، اپنے محبوب کو یاد کیا اور تنہائی کے سہارے زندگی بسر کی، ان کے رومانوی انداز کی دلکش مثال نظم ’’جینے کی ضمانت‘‘ ہے۔ترنم ریاض کی نظموں میں زندگی اور اس سے جڑے ہوئے تمام مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔حمیدہ شاہین کی شاعری میں معاصر زندگی کی جھلک نظر آتی ہے لیکن انھوں نے پدرشاہی معاشرے کے خلاف جذباتی ،کھوکھلی نعرے بازی، باغیانہ اور نفرت آمیز رویہ اختیار نہیں کیا۔ان کی نظمیں جذبہ، خیال اور اسلوب سے ہم آمیز ہو کر ایک نامیاتی وحدت کی شکل میں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ان کی شاعری مختلف عصری و نسائی حسیات سے متشکل ہوئی ہے۔نظم’’بتی سرخ ہے‘‘ کے یہ مصرعے ملاحظہ ہو:

آوازوں کا لشکر سر پر/ خیمے گاڑھے بیٹھ گیا ہے/ ہر شیشے پر/ کالی دھند کی موٹی تہ ہے/ چیل کے پنجوں جیسے بھدے بھدے منظر/ بینائی کو نوچ رہے ہیں/ بن موسم کی بارش سے سڑکیں بھیگی ہیں/ جن کو سبز اشارے کی توقیر ملی ہے/ وہ بندوق سے چھوٹی گولی کی رفتار سے بھاگ رہے ہیں/ سب اپنے اہداف کی جانب/ سانس دھویں میں لت پت سب کی/ اک دوجے سے/ آگے جانے کی بےچینی میں سب خود کو روندر ہے ہیں

حمیدہ شاہین نے سرخ بتی کی علامت میں پورے عصر کی رائگانی کو نشان زد کیا ہے۔جس نے انسان کو

بے حس ہونے کے ساتھ ساتھ فکری اور ذہنی انجماد کا شکار کر دیا ہے۔انھوں نے عالمی صارفی معاشرے کے فروغ پانے کی منظر کشی کی ہے۔ان کے شعری مجموعے ''زندہ ہوں'' میں عصری آشوب کے نوحوں کی تعبیر کرتی ہوئی نظموں میں ''بداوں کا بھنگڑا''، ''گھونٹ بھرے جانے تک''، ''اگر کل بچانا ہے''، ''وقت کا قصاص''، ''الٹا چکر''، ''ظلِ سبحانی''، ''کہیں بین بج رہی ہے''، ''جنگل''، ''خطا'' اور ''منصف کی کرسی خالی ہے'' اہم ہیں۔حمیدہ شاہین نے اپنی نظموں میں بے یقینی اور تذبذب کی کیفیات کو داخلی کرب سے ہم آمیز کر کے مادی سماج میں سانس لیتے ہوئے انسان کے جذبات کی تجسیم کی ہے۔

نسیم صحرائی اپنی نسل کی شاعرات میں کافی نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ''وسمی'' حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔وہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے اردگرد کی دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ان کی آزاد نظموں میں نسائی موضوعات اور استعارے بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔نسیم صحرائی نے اپنی نظم ''Possesive'' میں اپنے تانیثی طرز احساس کو شدت کے ساتھ تخلیقی پیرائے میں نظم کیا ہے۔وہ اپنے محبوب کو اپنے سوا کسی اور کے ساتھ کسی بھی صورت میں دیکھنے کی آرزومند نہیں ہے۔اس کے نزدیک اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ سانس لینا ہی ترک کر دے گی مراد یہ کہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہے گی۔نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اگر ہَوا تم کو/ چھو کے گزرے/ تو میں ہَوا کی مخالفت میں/ہَوا کو/ سانسوں کا رزق کرنا/ سانس لینا ہی/ چھوڑ دوں گی!

نسیم صحرائی کی نظموں میں نسائیت سے متعلق موضوعات اور استعارے بھرپور شعریت اور ادبیت کے ساتھ برتے گئے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں پروین شاکر کی طرح احساس محرومی، نارسائی اور نا آسودگی کے متعدد پہلو تراشے ہیں۔اس ضمن میں نظم ''خواہش'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

عمرِ رواں کے سورج ٹھہرو!/ میں نے بادل کے موسم کو/ خوب برستے دیکھنا ہے/اور ہَوا کو پینگ بنا کے/ایک ہلارا لینا ہے!

نسیم صحرائی کی نسائی لہجے کی اہم نظموں میں ''میں فقط اک جسم نہیں ہوں''، ''مَنت'' اور ''وسمی'' شامل ہیں۔ نسیم صحرائی اور پروین شاکر کی تانیثی فکر ایک جیسی ہے۔اس ضمن میں دو نظموں سے یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

سنا ہے/ اُس کو بچپن میں تتلیاں اچھی لگتی تھیں/اور وہ اکثر سارا دن اِن رنگ برنگی پریوں کے/ پیچھے بھاگتا رہتا تھا

مجھے کسی نے ابھی بتایا ہے/ اِس کی آنکھوں کے آئینوں میں/ جو عکس ہے/ وہ مرا نہیں ہے

نسیم صحرائی کی نظموں میں نیم شب ،شبنمی رت ،مہروماہ ،چاند کی روشنی، چھاؤں، دھوپ، رتجگے، تتلی، جگنو، پھول، خوشبو، خواب، چاندی میں ڈھلے رخسار، ستارہ آنکھیں، ہَوا انتظار، آنچل، آنگن، وسمی (بہار کی پہلی بارش)، بادل، شرط اور چودھویں کی شب کا چاند جیسے الفاظ متعدد بار آئے ہیں۔ان

کی شاعری موضوعاتی ،ہیئتی ،لسانی اور اسلوبیاتی اعتبار سے پروین شاکر سے مماثلت رکھتی ہے۔مردانہ اساس معاشرے میں عورت کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت اور پہچان نہیں۔معاصر شاعرات کی طرح نسیم صحرائی کی شاعری میں بھی یہ احساس ملتا ہے۔ان کی سماجی شعور سے مملو نظم ''میں جھنگ کی روایتی لڑکی ہوں'' کا یہ ٹکڑا دیکھیے :

میں فلاں کی پوتی ہوں/ میں ابنِ فلاں کی بیٹی ہوں/ نام ونسب کے جھولے سے / بچپن سے مانوس بہت ہوں/ میں خوش ہوں کہ / میرے نام کی اپنی کوئی پہچان نہیں/ میرے پیارے بھائیوں کے /اونچے شملے/اونچے ہیں

نسیم صحرائی احساسات وجذبات کی شاعرہ ہیں لیکن انھوں نے پوری آنکھیں کھول کر اپنے گرد کے سارے سچے منظر بھی دیکھے ہیں۔معاصر شاعرات کی نظموں کے تنقیدی وتحقیقی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں عصری اور تانیثی حسیّت بدرجہ اتم موجود ہے۔انھوں نے سماجی، سیاسی ،معاشی اور ہنگامی موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔انھوں نے ذہنی وجسمانی تشدد، جنسی استحصال، ناانصافی اور امتیازی سلوک کا شکار عورت کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کی ہے۔معاصر نظم گو شاعرات کی شاعری متنوع موضوعات اور ہیئتی تجربات سے متشکل ہونے کی وجہ سے متعدد اشتراکات سے گوندھی گئی ہے۔

حواشی:

۱۔ محسن نقوی، شاعرات کی شاعری، مشمولہ،خواتین کا نظم وغزل میلہ، مرتبہ،ضیا شاہد،(لاہور: علیم پبلشرز،۱۹۹۱ء)،ص:۱۳

۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو شاعرات،مشمولہ،عبارت،مرتبہ، ڈاکٹر نوازش علی،(راولپنڈی: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص:۱۲۱

۳۔ نبیل احمد نبیل،ڈاکٹر،مقدمہ، حیاتِ زرخ ش،مولفہ،انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ(لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)،ص:۱۷

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو شاعرات،مشمولہ،عبارت،مرتبہ، ڈاکٹر نوازش علی،(راولپنڈی: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص:۱۰۵

۵۔ وسیم بیگم، ڈاکٹر،آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیّت ،(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،۲۰۱۲ء)،ص:۱۴۱

۶۔ ایضاً،ص:۱۵۷

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو شاعرات،مشمولہ،عبارت،مرتبہ، ڈاکٹر نوازش علی،(راولپنڈی: دھنک پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء)،ص:۱۰۷

۸۔ ناہید قاسمی،ڈاکٹر،جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری،(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۲ء)، ص:۶۵۶

۹۔ راحت ملک، پروین شاکر شخصیت،فکرو فن،(اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء)،ص:۴۳۳،۴۳۷

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی،فلیپ، کتابِ جاں از ثمینہ راجہ،(لاہو:خزینہ علم و ادب،۲۰۰۵ء)

۱۱۔ محمود ہاشمی، دیباچہ،من بانی از شبنم عشائی،(دہلی: مکتبہ استعارا،۲۰۰۸ء)،ص:۱۸

مآخذ:

۱۔ احتشام علی،جدید اردو نظم میں عصری حسیّت،لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء

۲۔ ادا جعفری،ساز سخن بہانہ کروں،لاہور: غالب پبلشرز،۱۹۸۲ء

۳۔ پروین شاکر،ماہِ تمام (کلیات)،اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء

۴۔ ترنم ریاض، پرانی کتابوں کی خوشبو، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۵ء

۵۔ ثمینہ راجہ،کتابِ جاں (کلیات)،لاہور:خزینہ علم و ادب،۲۰۰۵ء

۶۔ حمیدہ شاہین،زندہ ہوں،لاہور:ملٹی میڈیا افیئر،۲۰۱۰ء

۷۔ راحت ملک، پروین شاکر شخصیت،فکر فن،اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز،۱۹۹۵ء

۸۔ زاہدہ زیدی، بہت دور تک رات ہوگی،علی گڑھ: آبشار پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء

۹۔ زہرا نگاہ،ورق،لاہور:اساطیر،اشاعت دوم،۲۰۰۶ء

۱۰۔ ساجدہ زیدی، جوئے نغمہ،نئی دہلی: انڈین اکیڈمی،۱۹۶۴ء

۱۱۔ ساجدہ زیدی،سیلِ وجود،لکھنو: نصرت پبلشرز،۱۹۷۹ء

۱۲۔ شاہین مفتی،ڈاکٹر،کشور ناہید شخصیت اور فن،اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء

۱۳۔ شبنم عشائی،کتھارسیس،دہلی: استعارہ پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء

۱۴۔ شفیق فاطمہ شعریٰ، سلسلۂ مکالمات (کلیات)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء

۱۵۔ صادقہ نواب سحر، انگاروں کے پھول، بمبئی: سرودیا اسٹودیو، ۱۹۹۲ء

۱۶۔ ضیا ساجد، مرتبہ، خواتین کا نظم و غزل میلہ، لاہور: علیم پبلشرز، ۱۹۹۱ء

۱۷۔ عتیق اللہ، ڈاکٹر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۵۵ء

۱۸۔ عذرا پروین، بارہ قباؤں کی سہیلی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء

۱۹۔ عنبرین منیر، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں نفسیاتی عناصر، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء

۲۰۔ فاطمہ حسن، یاد کی بارشیں (کلیات)، لاہور: روش پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

۲۱۔ فہمیدہ ریاض، بدن دریدہ، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۴ء